

پاکستانی خواتین کے سفرناموں میں صنفی بے راہ روی اور ثقافتی معنویت کی تشکیل Gender Transgression and the Construction of Cultural Meaning in Pakistani Women's Travelogues

ⁱⁱ ڈاکٹر نسرين امين

ⁱ روبينه

Abstract:

This paper presents a critical exploration of the concept of "gendered deviance" and its feminist interpretation in Pakistani women's travelogues. It also seeks to understand how cultural meaning is constructed within the context of different societies. The central aim of this study is to examine gendered deviance through a feminist lens, to clarify the process of cultural meaning-making across diverse social settings, and to trace shifts in meaning through a comparative analysis of Eastern and Western cultural perspectives. To achieve these aims, the study adopts a qualitative research approach, employing textual analysis within a feminist theoretical framework. Selected travelogues written by Pakistani women are used as primary sources, and are analysed in relation to their cultural observations and gendered experiences. The analysis highlights a clear contrast between the emphasis on individual freedom in Western societies and the importance of collective values in Eastern cultures. This contrast results in differing interpretations of "deviance" across cultural contexts. In some instances, women's freedom is portrayed as a form of moral deviation, while in others, it is seen as an expression of autonomy, a reconfiguration of identity, and a form of resistance to patriarchal norms. The findings suggest that gendered deviance is neither fixed nor universal; rather, it is a culturally and discursively constructed phenomenon whose meanings shift according to social and contextual realities. Pakistani women's travelogues, therefore, not only challenge conventional notions of gender identity but also represent women as dynamic, empowered agents who actively construct meaning and negotiate their own identities.

Keywords: Gendered Deviance, Feminist Interpretation, Pakistani Women's Travel Writing, Feminist Framework, Gender Identity, Patriarchal Structures, Cultural Discourse.

یہ مقالہ پاکستانی خواتین کے سفرناموں میں "صنفی بے راہ روی" کے تصور اور اس کی تائیدی تعبیر کا تنقیدی جائزہ پیش کرتا ہے، جس میں مختلف معاشروں کے تناظر میں "ثقافتی معنویت" کی تشکیل کے عمل کو بھی سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس تحقیق کا بنیادی مقصد پاکستانی خواتین کے سفرناموں میں "صنفی بے راہ روی" کے تصور کا تائیدی تجزیہ کرنا، ثقافتی معنویت کی تشکیل کے عمل کو مختلف معاشروں کے تناظر میں واضح کرنا، اور مغربی و مشرقی ثقافتی تصورات کے مطالعے کے ذریعے معنی کی تبدیلی کو سمجھنا ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے معیاری طریقہ تحقیق کے تحت مننی تجزیہ اور تائیدی نظریاتی فریم ورک کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ پاکستانی خواتین کے منتخب سفرناموں کو بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال کیا گیا اور ان میں مختلف ثقافتی مشاہدات اور صنفی تجربات کو بنیاد بنا کر تجزیہ کیا گیا۔ تجزیے سے یہ بات سامنے آئی کہ ان سفرناموں میں مغربی معاشروں کی انفرادی آزادی اور مشرقی معاشروں کی اجتماعی اقدار کے درمیان واضح تضاد موجود ہے، جس کے باعث "بے راہ روی" کا تصور مختلف ثقافتوں میں مختلف معنی اختیار کر لیتا ہے۔ بعض مقامات پر عورت کی آزادی کو اخلاقی انحراف کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جب کہ دیگر مواقع پر یہی آزادی خودمختاری، شناخت کی تشکیل نو اور پدرسری نظام کے خلاف مزاحمت کی علامت بن جاتی ہے۔ نتائج سے یہ واضح ہوتا ہے کہ "صنفی بے راہ روی" کوئی جامد یا آفاقی حقیقت نہیں بلکہ ایک ثقافتی اور بیانیاتی تشکیل ہے، جس کے معنی معاشرتی سیاق و سباق کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ جہاں جہ پاکستانی خواتین کے سفرنامے نہ صرف صنفی شناخت کے روایتی تصورات کو چیلنج کرتے ہیں بلکہ عورت کو ایک متحرک، بااختیار اور معنی ساز وجود کے طور پر بھی پیش کرتے ہیں۔

ⁱ اسکالر پی ایچ ڈی، شعبہ اردو، قرطبہ یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، پشاور کیمپس، پاکستان (Corresponding Author)

ⁱⁱ اسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، قرطبہ یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، پشاور کیمپس، پاکستان۔

کلیدی الفاظ: سفرناموں کا ادب، اردو سفرنامہ نگاری، پاکستانی خواتین کے سفرنامے، صنفی بے راہ روی، تانیثی تعبیر، ثقافتی معنویت، تانیثی نظریہ، صنفی شناخت۔

عورت کی شناخت اور اس کے کردار کو عموماً معاشرتی اقدار، مذہبی تصورات اور خاندانی روایتوں کے تناظر میں متعین کیا جاتا ہے، جہاں اس کے طرز حیات کو ایک مخصوص اخلاقی اور سماجی دائرے میں محدود رکھنے کی شعوری کوشش کی جاتی ہے۔ یہ دائرہ نہ صرف اس کے اعمال بلکہ اس کی فکر، خواہش اور اظہار کو بھی قابو میں رکھنے کی سعی کرتا ہے، اور اس سے انحراف کو ”بے راہ روی“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تاہم جدید سماجی و تنقیدی نظریات میں اس تصور کو محض اخلاقی انحراف نہیں بلکہ ایک سماجی تشکیل کے طور پر دیکھا جاتا ہے، جس کے ذریعے طاقت کے غالب ڈھانچے اپنی بالادستی کو برقرار رکھتے ہیں۔

تانیثی نظریات اس امر پر زور دیتے ہیں کہ صنفی کردار اور ان سے وابستہ حدود فطری نہیں بلکہ تاریخی، سماجی اور ثقافتی عمل کے ذریعے تشکیل پاتے ہیں۔ چنانچہ عورت کے رویوں کو ”مناسب“ یا ”نامناسب“ قرار دینے کے پیمانے بھی دراصل پدرسری نظام کی پیداوار ہوتے ہیں۔ فرانسیسی مفکرہ سیمون دی بووانے اسی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ عورت پیدا نہیں ہوتی بلکہ اسے بنایا جاتا ہے، اور اسے مرد کے مقابلے میں ایک ”دیگر“ (Other) کے طور پر متعین کر دیا جاتا ہے:

She is defined and differentiated with reference to man and not
he with reference to her; she is the incidental, the inessential
as opposed to the essential. He is the Subject, he is the
Absolute, she is the Other.¹

عورت کی اپنی شناخت خود سے نہیں بلکہ مرد کے حوالے سے متعین کی جاتی ہے، جب کہ مرد کی پہچان اس کے مقابلے میں عورت کے ذریعے نہیں بنتی۔ عورت کو ایک ضمنی اور غیر بنیادی حیثیت دی جاتی ہے، جب کہ مرد کو اصل اور مرکزی مقام حاصل ہوتا ہے۔ مرد کو فاعل، معیار اور مطلق سچائی سمجھا جاتا ہے اور عورت کو ”دوسرا“ قرار دیا جاتا ہے:

There is no gender identity behind the expressions of gender;
that identity is performatively constituted by the very

"expressions" that are said to be its results.²

صنفا اظہار کے پس پشت کوئی ایسی پہلے سے موجود یا مستقل صنفا شناخت نہیں ہوتی؛ بلکہ یہ شناخت انھی اعمال و اظہار کے ذریعے تشکیل پاتی ہے جنہیں عموماً اس کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے:

Gender is an identity tenuously constituted in time, instituted in an exterior space through a stylized repetition of acts.³

صنفا (جینڈر) ایک ایسی شناخت ہے جو وقت کے اندر نہایت نازک اور غیر مستقل طور پر تشکیل پاتی ہے؛ یہ کسی اندرونی یا پہلے سے موجود حقیقت کے طور پر نہیں بلکہ بیرونی سماجی دائرے میں اعمال کی ایک منظم اور طرز یافتہ تکرار کے ذریعے قائم کی جاتی ہے۔

سیمون دی بووانے سماجی تعمیریت (Social Constructionism) کے تصور کے تحت یہ مؤقف پیش کیا کہ صنفا کوئی فطری یا پیدائشی حقیقت نہیں بلکہ سماج کی طرف سے تشکیل دی جانے والی ایک ساخت ہے، یعنی معاشرتی، ثقافتی اور تاریخی عوامل مل کر عورت اور مرد کے کردار، رویوں اور شناخت کو متعین کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جوڈتھ بلٹرنے جینڈر پرفارمیٹیوٹی (Gender Performativity) کے نظریے کے ذریعے یہ وضاحت کی کہ صنفا کوئی جامد شناخت نہیں بلکہ ایک مسلسل دہرایا جانے والا عمل ہے، جو مختلف سماجی رویوں، زبان، حرکات اور طرز عمل کی بار بار ادائیگی سے وجود میں آتا ہے۔ اس طرح دونوں مفکرین اس بات پر متفق دکھائی دیتے ہیں کہ صنفا کوئی قدرتی یا مستقل حقیقت نہیں بلکہ سماجی اور عملی سطح پر تشکیل پانے والا ایک متحرک تصور ہے۔

پاکستانی ادبی تناظر میں بھی عورت کی شناخت کو زیادہ تر روایت، مذہب اور خاندانی نظام کے ساتھ منسلک کر کے دیکھا گیا ہے۔ ادبی متون میں فرد کی داخلی کشش دراصل معاشرتی جبر کی عکاسی ہوتی ہے۔ ادب میں معنی کی تشکیل ایک جامد عمل نہیں بلکہ ایک متحرک اور سیاقی عمل ہے، جس میں قاری، متن اور معاشرہ تینوں شریک ہوتے ہیں۔ یہ مطالعہ مغربی تائیشی نظریات (Social Constructionism) اور (Gender Performativity) کی روشنی میں پاکستانی خواتین کے منتخب سفر ناموں کا تجزیہ پیش کرتا ہے۔

تائیشی تناظر میں ”بے راہ و عورت“ محض اخلاقی زوال یا انحطاط کی علامت نہیں بلکہ وہ عورت کی خود اختیاری، آزادی اظہار اور روایت شکنی کا استعارہ بن جاتی ہے۔ جب کوئی عورت مرد سماجی حدود سے

ہٹ کر اپنی شناخت اور حق انتخاب کے لیے جدوجہد کرتی ہے تو معاشرہ اسے فوری طور پر ”بے راہ رو“ کا لیبل دے دیتا ہے۔ حالاں کہ اس کے اس رویے کو ایک مثبت فکری مزاحمت کے طور پر بھی دیکھا جاسکتا ہے، جو صنفی جبر اور سماجی پابندیوں کے خلاف ایک شعوری ردِ عمل ہے۔

پاکستانی خواتین کے سفر ناموں میں اس تصور کی پیشکش نہایت تہہ دار اور کثیرالجہتی ہے۔ یہاں عورت کی شناخت مقامی ثقافت، مذہبی اقدار اور خاندانی نظام کے ساتھ گہرے طور پر جڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہی عناصر اس کے کردار کی تشکیل میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، اور جب وہ ان سے انحراف کرتی ہے تو اس کا عمل محض ذاتی بغاوت نہیں رہتا بلکہ ایک سماجی و فکری بیانیہ اختیار کر لیتا ہے۔ یورپی معاشرے کے تناظر میں عورت اور ”بے راہ رو“ کے تصور کو عموماً آزادی نسواں، فردی خود مختاری اور سماجی کشادگی کے پس منظر میں دیکھا جاتا ہے۔ تاہم مشرقی خواتین جب اس معاشرت کا مشاہدہ کرتی ہیں تو انہیں اس آزادی کے بعض پہلو غیر مانوس بلکہ بعض اوقات اخلاقی طور پر متنازع محسوس ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کے سفر ناموں میں یورپ کا معاشرہ ایک ایسے مقام کے طور پر ابھرتا ہے جہاں رنگینی، آزادی اظہار اور کھلے طرز زندگی کے باعث ایک مختلف نوعیت کی سماجی فضا موجود ہے، جو ان کے اپنے ثقافتی پس منظر سے متصادم دکھائی دیتی ہے۔

اسی ضمن میں شین فرخ اپنے سفر نامہ نئی دنیا پرانی دنیا میں لندن کے مضافاتی علاقے ”سوہو“ کا ذکر کرتے ہوئے اسے ایک ایسی جگہ کے طور پر پیش کرتی ہیں جہاں مختلف النوع تفریحی اور سماجی سرگرمیاں ایک خاص ثقافتی فضا کو جنم دیتی ہیں۔ وہ اس علاقے کو مشرقی تناظر میں ”ہیرامنڈی“ سے تشبیہ دیتی ہیں، جہاں ریستوران، سینما، کلب، تھیٹر، ڈسکو اور دیگر تفریحی مراکز کی بھرمار ہے۔ شین فرخ کے بیانیے میں ”سوہو“ محض ایک جغرافیائی مقام نہیں بلکہ ایک تہذیبی اور ثقافتی تصادم کی علامت بن جاتا ہے، جہاں مشرقی عورت اپنی اقدار اور شناخت کے حوالے سے ایک نئے تجربے سے گزرتی ہے:

”سوہو“ کا لفظ دراصل ایک آواز ہے جو شکاری جنگلی خرگوشوں کا شکار کرتے ہوئے

لگاتے تھے اب یہاں جنگلی عورتیں مردوں کا شکار کرتی ہیں بلکہ یہ شکار تو شکاری کے

پاس خود چل کر جاتا ہے یہاں کے کوٹھے، تھیٹر کھلاتے ہیں۔^۳

شین فرخ نے لندن کے علاقے ”سوہو“ کی ہیرامنڈی کا ذکر کر کے یہاں کی اخلاقی پستی کو نمایاں

کیا ہے۔

سفر نامہ براہ راست میں بشری رحمن نے کینیڈا کے ایک ہیئر سیلون کے مشاہدے میں ایک خبرو مغربی لڑکی کا ذکر نہایت معنی خیز انداز میں کیا ہے۔ جب یہ لڑکی سیلون میں داخل ہوئی، تو وہاں موجود ہیئر ڈریسر خاتون نے اسے خاص توجہ دی۔ اس لڑکی کا لباس مغربی طرز کا تھا، جس میں اس کے شانے نمایاں تھے اور جسم پر نہایت مختصر لباس تھا، جو جدید مغربی معاشرتی رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔ دکان دار خاتون نے تجسس اور قدرے تنقیدی انداز میں اس سے سوال کیا کہ وہ اپنے جسم کی اس طرح نمائش کیوں کرتی ہے۔ اس کے جواب میں لڑکی نے ایک بظاہر سادہ مگر معنی خیز انداز اختیار کرتے ہوئے کہا کہ اسے گرمی بہت لگتی ہے۔ تاہم، جب اس نے یہ انکشاف کیا کہ وہ فرانسیسی سفارت خانے سے وابستہ ہے، تو دکان دار خاتون نے اس کے جواب کی تہہ میں پوشیدہ مفہوم کو سمجھتے ہوئے ذومعنی انداز میں اس کی گرمی لگنے کی وجہ جان کر کہا:

”تمہیں گرمی زیادہ لگتی ہے خوب مزے ہوں گے۔۔۔ ہے نا؟ تمہارے اوپر تو مرد

دیوانہ وار فدا ہوں گے۔“

”اونہ۔۔۔۔۔“ اس نے آئینے میں اپنا سراپا دیکھ کر کندھے اچکائے۔۔۔۔

”سارے مرد وہاں شادی شدہ ہیں۔“

دکان دار خاتون نے اسے راز دارانہ انداز میں اسے بتایا کہ شادی شدہ مرد ہی تو خطرناک، عیاش مزاج اور لڑکیوں کو پھنسانے میں ماہر ہوتے ہیں۔ یہ سن کر وہ لڑکی شیشے میں دیکھ کر ادا سے بولی: ”سارا دن تو ان کی بیویاں دفتر میں فون کرتی رہتی ہیں۔ ہاں تم جیسی بلا، اگر ان کے شوہروں کے گرد منڈلا رہی ہو انھیں خطرہ ضرور محسوس ہوتا ہوگا۔“^{۵۰}

کینیڈا کے سیاق میں بشری رحمن کے مشاہدات نہ صرف مغربی طرز زندگی کی ظاہری جھلک پیش کرتے ہیں بلکہ اس کے پس پردہ کارفرما سماجی و ثقافتی رویوں کو بھی بے نقاب کرتے ہیں۔ ایک جانب ہیئر سیلون میں آنے والی خبرو لڑکی کا واقعہ ہے، جو اپنے مختصر لباس کو محض ”گرمی“ کا جواز دے کر پیش کرتی ہے، مگر اس کے پیشے اور ماحول کو جاننے کے بعد اس جواز کی معنویت مزید گہری اور ذومعنی ہو جاتی ہے۔ اسی تسلسل میں مصنفہ ایک ایسی کینیڈین خاتون کا ذکر بھی کرتی ہیں جو جسم فروشی کے حوالے سے معروف ہے:

”پہلے شوہر سے ان بن ہو گئی تو دوسرا گھر لے آئی پھر ایک دن اس کو بھی نکال باہر

کیا ایک بچہ ہے ایک گھر ہے ایک موٹر ہے موٹر بھی خود چلاتی ہے اور پھر بھی
لوگوں کو کیا اعتراض ہے؟“
”اپنا آپ بھی چلاتی ہے۔۔۔۔۔“

اسی تناظر میں بشریٰ رحمن ایک اور واقعہ بیان کرتی ہیں، جس میں کینیڈا کی ایک خاتون کا ذکر آتا ہے جو ایک بچی کی ماں ہونے کے باوجود اپنے بوائے فرینڈ سے ملنے جا رہی تھی۔ یہ منظر مصنفہ کے لیے حیرت اور تجسس کا باعث بنتا ہے، کیوں کہ مشرقی معاشرتی اقدار کے تحت ماں کا کردار عموماً ایک مخصوص سنجیدگی، ذمہ داری اور خاندانی وابستگی سے جڑا ہوا تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اس طرز عمل کی وجہ جاننے کی کوشش کرتی ہیں تو انھیں بتایا جاتا ہے کہ:

یہاں سب چلتا ہے۔ یہ خاتون اپنے شوہر سے چھٹکارا پا چکی ہے۔ اب ایک غیر ملکی
سے دوستی لگالی ہے۔ گھر والے منع کرتے ہیں اس لئے ڈرائیونگ سیکھنے کے بہانے
چھپ چھپ کے اس سے ملنے جاتی ہے۔^۷

بشریٰ رحمن حیران ہو کر پوچھتی ہے کہ یہاں بھی یہ صورت حال ہے۔ تو انھیں بتایا جاتا ہے
جہاں رکاوٹ ہوگی پر نالہ اپنی جگہ خود بنا لے گا۔ اسی تناظر میں یہ بھی واضح کیا جاتا ہے کہ یہاں مسلمان
لڑکیاں بھی بوائے فرینڈ بناتی ہیں، باقاعدہ ڈیٹنگ کرتی ہیں، اور اپنی پسند سے شادی کے فیصلے کرتی ہیں۔
والدین کی مرضی کو وہ اپنی ذاتی زندگی کے فیصلوں میں فیصلہ کن حیثیت نہیں دیتیں۔ مزید برآں، مصنفہ کی
میزبان خاتون ایک مثال دیتے ہوئے اپنی سہیلی کی بیٹی کا ذکر کرتی ہیں، جو ایک مسلمان گھرانے سے تعلق
رکھنے کے باوجود اپنے عیسائی دوست سے شادی کا فیصلہ کرتی ہے۔ دونوں طویل عرصے تک ایک ساتھ رہے،
اور بالآخر لڑکی نے اپنے والدین کو واضح طور پر بتا دیا کہ وہ اسی شخص سے شادی کرے گی؛ بصورت دیگر وہ
عدالت کے ذریعے شادی کرنے پر آمادہ ہے۔ اس صورت حال میں والدین، سماجی اور خاندانی دباؤ کے باوجود،
بے بسی کے عالم میں اس رشتے کو قبول کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ٹیپووانسنی پروین عاطف کے مختلف ممالک کے اسفار کا ایک اہم مجموعہ ہے، جو ۱۹۹۵ء میں منظر عام
پر آیا۔ اس سفر نامے میں لکھنؤ، بیونس آئرس، ایمسٹرڈیم، بیجنگ، ہیروشیما، لندن اور دمشق کی سیاحت کے

حالات و مشاہدات شامل ہیں۔ انھوں نے وہاں کی تہذیب، ثقافت، طبقاتی نظام، معاشرت اور سیاسی حالات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ پیش کیا۔ اسی طرح انگلینڈ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے وہ یورپی معاشرے میں پائی جانے والی عریانیت اور جنسیت پرستی پر تنقیدی نظر ڈالتی ہیں، جو ان کے مشاہدات کا ایک اہم پہلو بن کر سامنے آتی ہے۔ سفر نامے میں لندن کے شب و روز کا ذکر کرتے ہوئے پروین عاطف ایک بیوٹی کلینک کا واقعہ بیان کرتی ہیں۔ دورانِ قیام وہ ایک کلینک جاتی ہیں جہاں موجود ریسیپشنسٹ لڑکی سے گفتگو کے دوران وہ بتاتی ہیں کہ کلینک سے فارغ ہونے کے بعد انھیں ارجنٹینا اور پھر واپس پاکستان کا سفر کرنا ہے۔ اس پر وہ لڑکی اپنے شوقِ سیاحت کا اظہار کرتی ہے۔ مصنفہ ازراہ مزاح اسے مشورہ دیتی ہیں کہ کسی خوش حال شخص یا ایئر لائن سے وابستہ فرد سے شادی کر لے تو اسے دنیا دیکھنے کا موقع مل سکتا ہے۔ تاہم اس کے جواب میں لڑکی ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے واضح کرتی ہے کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گی:

کسی کا منہ دیکھ دیکھ کر جینا مجھے زہر لگتا ہے یہ کر دو، کہاں جا رہی ہو۔ کیوں جا رہی ہو۔ کب آؤ گی، تنخواہ دے دو، وغیرہ وغیرہ۔ یہ Men باسٹرڈ، ساری دنیا میں ایک جیسے ہیں۔ عورت کو Taken for granted لینے والے۔ ایک مرد کے ساتھ مسلسل رہنا یوں بھی نرا عذاب ہے۔ وہ بولتی جا رہی تھی۔^۸

کیتھرین کے خیالات سن کر پروین عاطف اسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہیں کہ مرد بیکسر منفی نہیں ہوتے، بلکہ زندگی کے مختلف پہلوؤں میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اور عورت و مرد کا باہمی تعلق ایک فطری و سماجی ضرورت بھی ہے۔ تاہم کیتھرین اپنے تلخ اور قدرے انتقامی لہجے میں جواب دیتی ہے کہ اگرچہ مردوں میں ایک خاص کشش ضرور ہوتی ہے، مگر تاریخ میں انھوں نے جس طرح عورتوں کو محض استعمال کی شے سمجھا ہے، اب وقت آ گیا ہے کہ عورتیں بھی انھیں اسی طرح برتیں اور پھر غیر ضروری ہو جانے پر ترک کر دیں۔ گفتگو کے اس قدر تیز رخ کو نرم کرنے کے لیے پروین عاطف موضوع بدلتے ہوئے اس سے اس کے ذاتی تعلقات کے بارے میں دریافت کرتی ہیں۔ اس پر کیتھرین نہایت بے باکی سے بتاتی ہے کہ اس کے بیک وقت چھ بوائے فرینڈز ہیں، اور ہر ایک اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ وہی اس کی محبت کا واحد مرکز ہے۔ وہ اپنی ہفتہ وار مصروفیات کو اس طرح منظم کرتی ہے کہ ہر دن ایک مخصوص شخص کے لیے مختص ہے، جب کہ اتوار کا دن وہ اپنی ذات کے لیے مخصوص رکھتی ہے۔

یہ انکشاف سن کر مصنفہ حیرت کو ضبط کرتے ہوئے سوال کرتی ہیں کہ اگر ان تمام افراد کو حقیقت کا علم ہو جائے تو اس صورتِ حال کا انجام کیا ہوگا؟ اس پر کیتھرین نہایت اطمینان اور خود اعتمادی سے جواب دیتی ہے کہ ایسی صورت میں وہ بلا جھجک کسی اور راستے کا انتخاب کر لے گی، کیوں کہ اس کے نزدیک تعلقات کی بنیاد مستقل وابستگی نہیں بلکہ وقتی اطمینان اور ذاتی آزادی ہے:

بات کھل گئی تو ٹھوکر مار کر گھر سے نکال دوں گی، کیا آج تک یہ لوگ ہمارے ساتھ یہی کچھ نہیں کرتے آئے؟ میں یسوع مسیح کی وہ بھیڑ نہیں جو ایک گال پر تھپڑ کھانے کے بعد دوسرا پیش کر دے۔ یہ utility کی دنیا ہے۔ آج محبت کا نام ہے پیسہ، فراوانی، اگر وہ ہے تو سب کچھ تمہارا اور نہ سب جھوٹ۔۔۔^۹

کیتھرین کے مردوں اور شادی کے بارے میں تلخ اور قدرے انتقامی خیالات سن کر پروین عاطف گہرے فکری اضطراب میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ وہ اس بات پر غور کرنے لگتی ہیں کہ آیا کیتھرین واقعی ایک آزاد اور خود مختار عورت ہے، یا پھر اس کی یہ بظاہر آزادی دراصل ایک ردِ عملی کیفیت ہے، جس میں وہ ماضی کے ممکنہ تجربات یا اجتماعی صنفی رویوں کے خلاف ایک انتقامی طرزِ عمل اختیار کیے ہوئے ہے۔

ثریا آصف اپنے سفر نامے سفر وسیلہ، ظفر (سفر نامہ یورپ) میں بیان کرتی ہیں کہ بلجیم میں اپنے شوہر کے ہمراہ وہ ایک کازینو (casino) میں گئیں، جہاں جو اکھیلنے کا ایک مخصوص اور مشاہدہ طلب منظر ان کے سامنے تھا۔ اس ماحول میں خواتین مردوں کو جو اکھیلنے میں معاونت فراہم کر رہی تھیں، جب کہ ان کا لباس انتہائی چست اور نیم عریاں تھا۔ مزید برآں، ہر خاتون نے اپنے سر پر خرگوش کے کانوں کی شکل کی سفید کیپ پہن رکھی تھی، جو اس کلب کی ایک علامتی پہچان تھی۔

مصنفہ اس منظر کو دیکھ کر حیرت اور افسوس کے ملے جلے جذبات کا اظہار کرتی ہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک یہ صورتِ حال عورت کے روایتی تصور سے خاصی مختلف تھی۔ تاہم، یہ بھی ایک اہم نکتہ ہے کہ وہاں موجود خواتین اپنے پیشے اور طرزِ زندگی سے بظاہر مطمئن دکھائی دیتی تھیں۔ اس کے باوجود مصنفہ یورپ میں عورت کی اس طرح کی آزادی کو ایک تنقیدی نظر سے دیکھتی ہیں اور اسے مشرقی اقدار کے تناظر میں قابلِ قبول نہیں سمجھتی۔ مصنفہ کو یورپ کی آزادی نسواں کا کافی کھٹکتی ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتی ہیں:

یورپ میں آزادی نسواں کے نام پر عورت کا استعمال کیسے کیسے کیا جاتا ہے، عورتوں

کے حقوق اور آزادی کی جوہر مغرب سے اٹھی ہے ہم ان کے ماحول سے بے خبر لوگ کس طرح اس تحریک کی سچائی کی گواہی دیتے ہوئے اپنے لیے بھی ویسی ہی آزادی مانگتے ہیں حالانکہ اس طرح کی آزادی ہماری عورتوں کے لیے نہ قابل تقلید ہے اور نہ ہی قابل عمل۔^{۱۰}

رضیہ بٹ نے سفر نامے امریکی یا ترائیاں امریکی معاشرے کے مختلف پہلوؤں کو نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کرتی ہیں۔ وہ جہاں امریکا اور خصوصاً نیویارک کی ترقی، خوب صورتی اور تہذیبی چمک دمک کا ذکر کرتی ہیں، وہاں اس معاشرے کے بعض ایسے منفی اور تاریک پہلوؤں کو بھی اجاگر کرتی ہیں جو بظاہر حسین چہروں کے پیچھے ایک بد صورت حقیقت کے طور پر موجود ہیں۔

مصنفہ کے مطابق نیویارک جیسے ترقی یافتہ شہر میں بھی سماجی ناہمواری، اخلاقی انحطاط اور انسانی تنہائی جیسے مسائل نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں، جو اس کی مجموعی چمک دمک پر ایک سوالیہ نشان بن جاتے ہیں۔ اس تناظر میں وہ امریکی معاشرے کے اس پہلو کو بھی بے نقاب کرتی ہیں جو ظاہری ترقی کے باوجود اندرونی طور پر کئی تضادات اور مسائل کا شکار ہے۔ یوں رضیہ بٹ کا یہ مشاہدہ محض ایک سیاحتی بیان نہیں رہتا بلکہ ایک تنقیدی تجزیہ بن جاتا ہے، جو ترقی یافتہ معاشروں کے اندر چھپی ہوئی سماجی حقیقتوں کو سامنے لاتا ہے۔ مصنفہ نیویارک کے معاشرے کا ایک بھیانک رُخ بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

ان فٹ پاتھوں پر اکثر حسین اور جمیل عورتیں جذبات انگیز لباسوں میں ملبوس ہیروین کا کاروبار بھی کرتی پائی جاتی ہیں۔ ناز واداکے داؤد کھاتے ہوئے مردوں کو سگریٹ کی پیش کش ان کا پہلا حربہ ہوتا ہے پھر بے تکلفی پر اتر آتی ہیں، قربتوں کو مہکاتی ہیں اور اپنا کام شروع کر دیتی ہیں۔ ڈٹیس کی منتظر لڑکیاں اپنا شکار تلاش کرنے کو یہاں گھومتی پھرتی رہتی ہیں، گوری رنگت، سنہرے بال، نیلی آنکھیں اپنا سحر دکھاتی ہیں اور شکار قابو میں آ جاتا ہے۔"

رضیہ بٹ اپنے سفر نامے امریکی یا ترائیاں میں جہاں امریکی معاشرے کے ترقی یافتہ اور روشن پہلوؤں کو بیان کرتی ہیں، وہاں اس کے پس پردہ موجود سماجی ناہمواریوں اور محرومیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتیں۔ اسی تناظر میں وہ امریکہ کے ایک اور علاقے کا ذکر کرتی ہیں جسے ہارلیم کہا جاتا ہے، جو سیاہ فام آبادی کا ایک

نمایاں علاقہ ہے۔

مصنفہ کے مشاہدے کے مطابق اس علاقے کی حالت ایک ایسے ماحول کی عکاسی کرتی ہے جیسے وہاں کسی بڑے حادثے یا زلزلے کے اثرات موجود ہوں۔ جلی ہوئی عمارتیں، جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر، میلے کھیلے لباس میں ملبوس افراد اور مجموعی طور پر بد حالی کا منظر ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے جو ترقی یافتہ امریکا کے روشن چہرے کے برعکس ایک تاریک پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ مناظر بظاہر ایک ہی ملک کے اندر موجود دو مختلف معاشرتی حقیقتوں کے درمیان واضح فرق کو نمایاں کرتے ہیں۔ سفر نامہ نگار نے بتایا:

شادی یا شادی کے بغیر افزائش نسل ان کا مشغلہ ہے۔ بچے پیدا کر کے ان کے مرد ذمہ داری قطعاً نہیں اٹھاتے، مائیں جوان قانونی یا غیر قانونی بچوں کو جنتی ہیں ساری ذمہ داری ان پر ڈال کر یا تو فرار اختیار کر لیتے ہیں یا لا تعلق بن جاتے ہیں۔ مائیں اب ان کو پالیں یا تھوڑا بہت کام کر کے روزی کمائیں وہ دونوں کام ہی پوری طرح نہیں کرتیں۔"

ان علاقوں میں عورتوں کی حالت قابلِ رحم ہے، نہ رہنے کو مکان ہے، نہ پہنے کو کپڑا، نہ کھانے کو روٹی بس صرف ناجائز اولاد کو جنم دے کر ان کو پالنا، چاہے جیسے بھی ہوں ان کی تا مرگ ذمہ داری رہتی ہیں۔ کسی بھی معاشرے کی ترقی صرف اس کے مرکزی یا خوش حال علاقوں تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ اس کے پس پردہ موجود پسماندہ طبقات بھی اسی سماج کا حصہ ہوتے ہیں۔ یوں رضیہ بٹ کا یہ بیان امریکا کے اندر موجود طبقاتی تفاوت اور سماجی ناہمواری کو ایک علامتی اور تنقیدی انداز میں سامنے لاتا ہے۔

کو کب خواجہ اپنے سفر نامے ہیلو امریکہ میں امریکہ کے اس پہلو کو بھی اجاگر کرتی ہیں جو انسانی حقوق، آزادی اظہار اور سماجی رویوں کے تنوع سے متعلق ہے۔ مصنفہ کے مطابق امریکا کو عمومی طور پر ایک ایسے ملک کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جہاں انسانی حقوق کے ساتھ ساتھ جانوروں کے حقوق کا بھی بھرپور خیال رکھا جاتا ہے، اور جہاں ہر مذہب و نسل کے افراد کو اپنی زندگی اپنے انداز سے گزارنے اور اظہارِ رائے کی مکمل آزادی حاصل ہے، بغیر کسی سخت سماجی یا قانونی پابندی کے۔

اسی تناظر میں جب مصنفہ امریکا کے سفر پر جاتی ہیں تو وہ ایک ایسے سماجی مظہر کا مشاہدہ کرتی ہیں جہاں ہم جنس پرستی کے حوالے سے ایک خصوصی دن منایا جا رہا تھا۔ سان فرانسسکو کو اس حوالے سے ایک

نمایاں مرکز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، جہاں باقاعدہ پریڈ کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس پریڈ میں مختلف شہروں سے تعلق رکھنے والے، مختلف رنگ و نسل کے افراد شریک تھے، جو ہم جنس تعلقات کی حمایت اور ان کی قانونی حیثیت کو تسلیم کرنے کے مطالبے کے ساتھ سڑکوں پر موجود تھے۔ اس موقع پر بعض شرکاء کی جانب سے ہم جنس شادی کو قانونی قرار دینے اور شادی شدہ افراد کے لیے بھی ایسے تعلقات کو قابل قبول بنانے کی اپیلیں کی جا رہی تھیں۔ اس پریڈ کا احوال مصنفہ یوں بیان کرتی ہیں:

مرد عورت کی طرح بنے سنورے اور رنگین چمکیلے لباسوں میں اور لڑکیاں تقریباً بے لباس ہی ہیں۔ ان ننگوں کے ہجوم میں اگر کوئی خاتون پاؤں تک لمبی سکرٹ یا پینٹ شرٹ میں دکھائی دیتی ہیں تو آنکھوں کو ایک دم ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔ میں سوچ رہی ہو کہ ہمارے مذہب میں تو عورت کے سر کے بال کا بھی اس قدر پردہ ہے کہ حجاب یا دوپٹے سے ڈھانپنے کی ہدایت کی جاتی ہے، مگر یہ سب عورتیں جو میرے ارد گرد کھڑی اس پریڈ کو دیکھنے کے لیے آئی ہوئی ہیں، یہ دوزخ کے کس حصہ میں رکھی جائیں گی۔^۳

عمرانہ کو مل اپنے سفر نامے ملتان بنجارن اور کولمبس کا دیس میں نیویارک کے قیام کے دوران اپنے مشاہدات کو نہایت تفصیل اور تجزیاتی انداز میں بیان کرتی ہیں۔ سیر و تفریح کے دوران میں وہ اپنے گروپ کے ہم راہ ایک کلب میں داخل ہو کر ایک ٹیبل کے گرد براجمان ہو جاتی ہیں۔ اسی دوران میں دو خواتین ان کے ٹیبل پر آ کر بیٹھتی ہیں، جن سے گفتگو کے دوران معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک خاتون، مس بلی، آسٹریلیا سے تعلق رکھتی ہے اور اپنی ساتھی کے ہم راہ یہاں سیر و تفریح کے لیے آئی ہوئی ہیں۔ گفتگو کے دوران وہ یہ انکشاف کرتی ہیں کہ وہ اپنی اسی ساتھی کو اپنا شریک حیات بنانے کے لیے باقاعدہ قانونی دستاویزات بھی بہیں تیار کر رہی ہیں، کیوں کہ ان کے اپنے ملک کے قوانین انھیں اس نوعیت کی شادی کی اجازت نہیں دیتے۔ ملتان بنجارن اور کولمبس کا دیس میں مصنفہ لکھتی ہیں کہ:

اتنے میں ہمارے ہی ٹیبل پر دو خواتین آ کر بیٹھ گئیں جن سے تھوڑی گپ شپ ہوئی تو معلوم ہوا کہ آسٹریلیا سے آنے والی مس بلی bili اپنی ساتھی کے ساتھ یہاں سیر و تفریح کے لیے آئی ہیں بلکہ وہ اپنی ساتھی کو اپنا شریک حیات بنانے کے لیے

باقاعدہ دستاویزات بھی یہیں بنوائیں گی کیوں کہ ان کے ملک کا قانون انھیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔^{۱۳}

یہ بات سن کر عمرانہ کو مل اور ان کی ساتھی خواتین حیرت اور تجسس کے طے جلے جذبات کے ساتھ ان سے مزید سوالات کرتی ہیں، جن کا مس بلی نہایت اعتماد اور بے تکلفی سے جواب دیتی ہیں۔ ان کا طرز گفتگو اور خود اعتمادی اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ وہ اپنے فیصلوں اور طرز زندگی کے بارے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتیں۔

کسٹور ناہید اپنے سفر نامے آ جاؤ افریقہ میں افریقہ کے ایک علمی و سماجی کانفرنس کا ذکر کرتی ہیں، جس میں مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والی خواتین نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں بعض ہم جنس پرست خواتین نے مرد کی بالادستی (patriarchy) کے خلاف واضح موقف اختیار کرتے ہوئے آزادی نسواں کے حوالے سے اپنے نظریات پیش کیے۔

ان کے مطالبات میں جسمانی خود مختاری، جنسی تعلقات میں انتخاب کی آزادی، اور مرد کی اطاعت یا سماجی برتری کے تصور سے انکار جیسے نکات شامل تھے۔ یہ گفتگو جدید نسوانی تحریکوں کے ان رجحانات کی عکاسی کرتی ہے جو عورت کو مکمل طور پر اپنے جسم، فیصلوں اور شناخت کی مالک سمجھنے پر زور دیتے ہیں۔

کسٹور ناہید جب ان خواتین سے ان کے مردوں کے بارے میں سخت اور تنقیدی رویے کی بابت سوال کرتی ہیں تو ان میں سے ایک خاتون نہایت صاف گوئی اور دو ٹوک انداز میں اپنی رائے کا اظہار کرتی ہے۔ اس کا موقف اس پورے مباحثے میں موجود فکری شدت اور نظریاتی اختلاف کو مزید واضح کر دیتا ہے:

میں نے اُس کا نام پوچھا۔۔۔ ”لینا“۔۔۔ ”ملک“ ”کیسٹین آئی لینڈ“۔۔۔ ”تم ہم پہ کچھ لکھو گی“ پھر وہی سوال تھا؟ ”ہاں“ میری سوچ کے برخلاف۔۔۔۔۔ میرے منہ سے نکلا: ”مجھے بتاؤ تو۔۔۔۔۔ تم مرد سے نفرت کیوں کرتی ہو۔۔۔۔۔“ ”نفرت۔۔۔۔۔ ہم مرد سے نفرت تو نہیں کرتے۔۔۔۔۔ مرد کو ہماری ضرورت نہیں۔ مرد کے لیے عورت ضرورت نہیں رہی۔ مرد کو عورت صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے چاہیے۔ مرد کو احساس اور سپردگی کی طمانیت کے لیے، عورت نہیں چاہیے۔“^{۱۴}

لینا عورت کے کردار کی تشکیل میں معاشرتی رویوں کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ اس کے مطابق

سماج نے عورت کے ذہن میں یہ تصور راسخ کر دیا ہے کہ اس کی شناخت اور وجود کی تکمیل صرف ماں بننے کے بعد ہی ممکن ہے۔ یہ تصور وقت کے ساتھ ساتھ عورت کے شعور کا مستقل حصہ بن گیا اور اس کی فکری ساخت میں گہرائی سے سرايت کر گیا۔ اسی طرح معاشرتی بیانیے میں عورت کو اکثر ہر فساد اور برائی کی جڑ قرار دیا گیا، جسے عورت نے طویل عرصے تک بلاچوں وچراں قبول بھی کیا۔

مزید برآں، عورت کو صبر و ایثار کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا، جس کے نتیجے میں اس نے ہر طرح کے ظلم، جبر اور ناانصافی کو اپنی ذمہ داری سمجھ کر برداشت کرنا اپنا فریضہ سمجھ لیا۔ اس معاشرتی رویے نے عورت کے وجود کو محض ظاہری زیب و زینت اور گھریلو دائرے تک محدود کر دیا، جب کہ یہ تصور بھی راسخ کیا گیا کہ فکری و عملی میدان دراصل مرد کے لیے مخصوص ہیں اور عورت کے لیے اصل کمال صرف اپنے ظاہری حسن و آرائش کو برقرار رکھنا ہے۔

کسٹور ناہید کی تحریر میں کرسٹینا کا کردار اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ بیوی ہونا اکثر سماجی طور پر ایک ایسے فریضے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جس میں عورت کے جذبات، احساسات اور انفرادی خواہشات کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ اس تناظر میں ازدواجی زندگی کو بعض اوقات ایک ایسی مجبوری کے طور پر دکھایا جاتا ہے جس میں عورت کی ذات اور اس کی باطنی خواہشات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اور اس کی انفرادی شناخت ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہے:

”میا تم کبھی مرد کے تعلق میں نہیں رہیں“، میں نے بات کو ایک اور رخ دینے کی کوشش کی۔ کرسٹینا نے سگریٹ سلگا یا اور آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے بولی ”میں شادی شدہ ہوں، میرا ایک بیٹا ہے مگر مجھے لڑکھن ہونا فطری لگتا ہے اور بیوی ہونا، زبردستی۔ میرے اندر کے وجود کو بھی چاہیے۔ میں شوہر سے کھل کر بات کروں تو فوراً سوال، یہ تم نے کیسے سیکھا۔ اس کا تمہیں کیسے پتہ چلا۔ تم کو یہ بات کس نے بتائی کسی مرد نے بتائی لگتی ہے تم سے اُس نے ایسے گفتگو کیسے کی۔ آپ کو جان بوجھ کر بے جان، بے روح اور بے لذت انداز اختیار کر کے بیوی بنا پڑتا ہے۔“^{۱۴۴}

کرسٹینا اس امر کی نشان دہی کرتی ہے کہ پدرسری معاشرے میں عورت کو اپنی ذاتی خوشی اور فطری احساسات کو اکثر پس پشت ڈالنا پڑتا ہے۔ اس سماجی نظام میں عورت اگر مرد کے ساتھ کھل کر گفتگو

کرے یا اپنی رائے کا واضح اظہار کرے تو اس کے کردار کو مشکوک سمجھا جاتا ہے اور اس کی شخصیت پر مختلف سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ اس طرح عورت کے اظہارِ ذات کو محدود کر کے اسے ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے، جہاں وہ ایک فعال فرد کے بجائے ایک تابع کردار کے طور پر سامنے آتی ہے۔ نتیجتاً عورت کو بعض اوقات ایک ایسے وجود کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو بے جان، بے روح اور محض سماجی فرائض کی ادائیگی تک محدود ہو، گویا اس کی تخلیق کا مقصد صرف ایک طے شدہ سماجی کردار ادا کرنا رہ گیا ہو۔ یہی فکری زاویہ کشور ناہید اپنی تحریروں میں مختلف سطحوں پر اجاگر کرتی ہیں، جہاں وہ مرد و عورت کے تعلقات کو محض جذباتی یا سماجی ربط کے بجائے ایک ایسے نظام کے طور پر دیکھتی ہیں جس میں طاقت، اختیار اور جبر کے عناصر نمایاں ہوتے ہیں۔ یہی رویہ کشور ناہید نے اپنی تحریر میں ایک اور زاویے سے اجاگر کیا ہے، جہاں وہ مرد و عورت کے تعلقات کو تشدد اور جبر کے تناظر میں بیان کرتی ہیں:

مرد کو جب شہوت جاگے، عورت کی عصمت لوٹ لیتا ہے۔ گھر کی بی بی پر اپنا حکم جتاتا ہے مگر عورت جب عورت کے ساتھ پیار کرتی ہے۔ تو یوں وحشیانہ طور پر حملہ آور ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی وہ یوں دوسری عورت کے ساتھ زیادتی کرتی۔ اور اگر مرد کو عورت نہ ملے تو اس کے منہ پر تیزاب پھینک، قتل کر، اغوا وغیرہ۔۔۔ یہ ساری حرکتیں کبھی تم نے لڑپین کی بھی سنی ہیں۔^{۱۴}

کشور ناہید اپنے سفر نامے آجاؤ افریقہ میں مردانہ رویوں اور عورتوں کے باہمی تعلقات کے درمیان فرق کو ایک تنقیدی زاویے سے پیش کرتی ہیں۔ ان کے مشاہدے کے مطابق پدرسری معاشرے میں مرد بعض اوقات اپنی جنسی اور سماجی خواہشات کی تکمیل کے لیے عورت پر جبر، زبردستی اور تشدد کرتا ہے، اور ازدواجی رشتے میں بھی اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لیے مختلف ذرائع استعمال کرتا ہے۔

اس کے برعکس، بعض نسوانی مکالمات میں عورتوں کے باہمی تعلقات کو نسبتاً مختلف انداز میں بیان کیا جاتا ہے، جہاں انھیں زیادہ تر باہمی رضامندی، نرمی اور جذباتی وابستگی پر مبنی سمجھا جاتا ہے۔ اس تناظر میں ایک رائے یہ بھی سامنے آتی ہے کہ جب مرد کی خواہشات کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا ہو تو وہ بعض اوقات شدت پسند رویوں، حتیٰ کہ تشدد یا سنگین جرائم جیسے تیزاب پھینکنے، قتل یا اغواتک کا سہارا لیتا ہے، جب کہ عورتوں کے باہمی تعلقات میں اس نوعیت کے جارحانہ رویے نسبتاً کم دیکھے جاتے ہیں۔

ثریا حفیظ الرحمن سفر نامے جس دیس میں گنگا بہتی ہے میں قدیم ہندوستانی معاشرت کے مذہبی اور سماجی ڈھانچے کا ذکر کرتے ہوئے عورت کی حیثیت پر تفصیلی گفتگو کرتی ہیں۔ ان کے مطابق قدیم معاشرے میں عورت کو مذہب کے نام پر متعدد سماجی پابندیوں اور بعض صورتوں میں استحصال کا سامنا رہا۔ وہ ہندو شاستروں اور اساطیری حوالوں کی روشنی میں یہ نکتہ بھی بیان کرتی ہیں کہ بعض روایتی تصورات میں عورت کے کردار کو مخصوص حدود میں متعین کیا گیا تھا، جیسے مہابھارت کی دروپدی کا کردار جو ایک ہی وقت میں پانچ پانڈوؤں کی مشترکہ زوجہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

مصنفہ مزید اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ بعض تاریخی و مذہبی حوالوں میں عورتوں کو مذہبی رسومات اور درباری یا مذہبی پیشواؤں کی خدمت جیسے کرداروں میں بھی شامل کیا جاتا رہا، جس سے ان کی سماجی حیثیت اور کردار کے بارے میں مختلف تعبیرات سامنے آتی ہیں۔

تاہم ثریا حفیظ الرحمن کے مطابق موجودہ دور میں بھی بعض خطوں میں انہی قدیم روایات اور ثقافتی تصورات کو مذہبی یا تہذیبی ناموں کے تحت نئے انداز میں پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ اس بات پر بحث کرتی ہیں کہ جدید معاشرے میں عورت کی آزادی، اس کے حقوق اور سماجی کردار کے حوالے سے مختلف بیانیے سامنے آرہے ہیں، جن میں روایتی خاندانی نظام اور انفرادی آزادی کے درمیان ایک کشمکش دیکھی جاسکتی ہے:

شادی کے بغیر کسی مرد کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کرنا یا ایک عورت کا دو عدد پتی رکھنا باعث فخر سمجھا جاتا ہے۔ بھارت کے ایک مشہور ہفت روزہ میں ایک استری کا جس کے دو پتی تھے، انٹرویو بڑے طمطراق سے مع تصاویر شائع ہوا۔ اس پر ادارے لکھے گئے اور اس بات کی بڑی حوصلہ افزائی کی گئی کہ ہندو دھرم کے مطابق ہندو عورت اپنی ذاتی حیثیت میں بالکل آزاد ہے۔ وہ جس طرح چاہے زندگی بسر کرے۔ جتنے مردوں سے چاہے شادی کرے۔ ہندو عورت اب شادی بیاہ کا بندھن خود بھی توڑ رہی ہے۔^{۱۸}

لامتناہی رسم و رواج اور پدرسری نظام کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی عورت اب رفتہ رفتہ سماجی میدان میں اپنے وجود کا اظہار کر رہی ہے۔ وہ روایتی جبر سے نکل کر ایک ایسی زندگی کی طرف بڑھ رہی ہے جہاں وہ اپنی مرضی اور فیصلوں کے مطابق سماج سے مکالمہ کرتی ہے اور بعض اوقات اس سے ٹکر بھی لیتی

ہے۔ اس کے مطابق آزاد زندگی میں اسے یہ خوف لاحق نہیں رہتا کہ اسے گھر سے نکال دیا جائے گا، تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا، جلا یا جائے گا یا جھوٹے الزامات کی بنیاد پر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں گی۔ اس کے برعکس وہ اپنے تعلقات اور بندھنوں کو اپنی مرضی سے جوڑنے اور توڑنے کی آزادی رکھتی ہے۔

اسی سلسلے میں ایک اور واقعے کا ذکر کرتے ہوئے مصنفہ بیان کرتی ہیں کہ ان کی ایک شناسا، جو سنسکرت کی لیکچرار 'دکشا' ہیں، نے انھیں اپنے تجربات اور مشاہدات سے آگاہ کیا:

ان کی ایک ساتھی لیکچرار تین بچوں کے ساتھ ایک پہلے سے شادی شدہ مرد کے ساتھ آزاد زندگی بسر کر رہی ہے۔ مرد کے بھی چار بچے ہیں اور اس نے اپنی بیٹی کو چھوڑ رکھا ہے۔ اب وہ ساتھی لیکچرار سات عدد بچوں کی آئیگری بھی کر رہی ہے اور آگے بچے بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ دکشا نے بڑے دکھ سے کہا کہ ہماری ساتھی لیکچرار اوپر سے چاہے کتنا ہی بنے مگر اندر سے نہایت دکھی ہے۔^{۱۹}

سبوحہ خان اپنے سفر نامے دلی سے ڈیفنس نک میں ایک ایسے گھریلو اور سماجی واقعے کا ذکر کرتی ہیں جو ازدواجی تعلقات میں توجہ، بے رخی اور اس کے ممکنہ نتائج کو نمایاں کرتا ہے۔ مصنفہ کے مطابق ان کے پڑوس میں ڈاکٹر یوسف اور ان کی اہلیہ مسز یوسف رہتے تھے، جن کے تین بیٹیاں اور تین بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا لندن میں زیر تعلیم تھا۔ مسز یوسف ایک دہلی، سانولی مگر نہایت سچی سنوری اور فیشن کی شوقین خاتون تھیں، جب کہ ڈاکٹر یوسف اپنے پیشہ ورانہ کاموں میں اس قدر مصروف رہتے تھے کہ وہ اپنی بیوی کی طرف توجہ دینے کا وقت نہیں نکال پاتے تھے۔ اسی گھریلو ماحول میں ان کی بڑی بیٹی طاہرہ، جو ایف ایس سی کی طالبہ تھی، اپنی والدہ کی طرح خوب صورتی اور فیشن کی طرف رجحان رکھتی تھی۔ اسی دوران گھر میں ڈاکٹر یوسف کے بیٹے کے دو دوست آنے لگتے ہیں۔ ان میں سے ایک دوست طاہرہ میں دل چسپی لینے لگتا ہے، جب کہ دوسرا مسز یوسف کے ساتھ قربت بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس پورے عرصے میں ڈاکٹر یوسف ان حالات سے مکمل طور پر بے خبر رہتے ہیں۔

بالآخر ایک دن مسز یوسف اپنے چار چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر گھر سے چلی جاتی ہیں۔ جب یہ واقعہ پیش آتا ہے تو ڈاکٹر یوسف کو حالات کی سنگینی کا احساس ہوتا ہے، تاہم اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ مصنفہ کے مطابق ڈاکٹر یوسف کی طویل غفلت اور ازدواجی بے توجہی اس سانحے کی بنیادی وجہ کے طور پر

سامنے آتی ہے، اور یوں یہ واقعہ ایک ایسے خاندانی المیے کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس میں عدم توجہی اور جذباتی خلا مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ مصنفہ اس بابت لکھتی ہیں کہ:

مسز یوسف ان عورتوں میں سے نہیں تھیں جو بے حس پتھر کی طرح اپنے شوہر کو پوجتی رہتی ہیں۔ وہ ایک جیتی جاگتی جذبات سے بھرپور عورت تھیں۔ اتنی جذباتی کہ ان کی اپنی خود غرضی ان کے مامتا کے جذبے پر چھا گئی۔ بچے بے یار و مددگار رہ گئے۔^{۲۰}

سیوحہ خان دلی سے ڈیفنس تک میں مسز یوسف کی زندگی کے تسلسل کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ شوہر کی مسلسل بے توجہی اور جذباتی لا تعلقی کے باعث مسز یوسف نے اپنے لیے باہر ایک متبادل محبت اور توجہ تلاش کرنا شروع کر دی۔ اس عمل میں وہ گھریلو ذمہ داریوں اور خصوصاً مامتا کے جذبے کو پس پشت ڈال کر اپنی ذاتی خواہشات کے تعاقب میں گھر اور بچوں کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ مصنفہ کے مطابق چند سال بعد وہ ایک بچی کے ہم راہ دوبارہ ڈاکٹر یوسف کے گھر واپس آتی ہیں۔ ابتدا میں ڈاکٹر یوسف انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں، تاہم بچوں کی جذباتی وابستگی اور اصرار کے باعث وہ انھیں گھر میں رہنے کی اجازت دے دیتے ہیں، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ ان کی نظروں کے سامنے کم سے کم آئیں اور ایک محدود حیثیت میں زندگی گزاریں۔ یوں مسز یوسف اپنے پہلے فیصلے کے بعد ایک مختلف اور محدود کردار کے ساتھ اسی گھر میں واپس آ جاتی ہیں، جہاں وہ کبھی بیوی کے طور پر موجود تھیں۔ اب ان کی حیثیت بدل چکی ہوتی ہے اور وہ ایک ماتحت اور محدود سماجی کردار میں زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

شگفتہ فرزا اپنے سفر نامے ستارے سفر کے میں سنگاپور اور مشرقِ بعید کے بعض شہروں میں جسم فروشی کے سماجی و تاریخی پس منظر پر گفتگو کرتی ہیں۔ ان کے مطابق ان خطوں میں بعض مقامات پر اس پیشے کو قانونی تحفظ بھی حاصل رہا ہے، اور اس کی جڑیں خاص طور پر دوسری جنگِ عظیم کے بعد کے حالات سے جڑی ہوئی ہیں، جب یہ علاقے مختلف فاتحِ افواج کے زیر اثر رہے۔ مصنفہ تاریخی تناظر میں بیان کرتی ہیں کہ اس دور میں سنگاپور اور اطراف کے علاقے مختلف فوجی قوتوں کے قبضے میں رہے، جس کے نتیجے میں سماجی ڈھانچا شدید طور پر متاثر ہوا۔ اس زمانے میں اخلاقی و سماجی اقدار کی کم زوری اور جنگی حالات کے اثرات نے بعض منفی معاشرتی رجحانات کو فروغ دیا، اور جسم فروشی کو بعض علاقوں میں معمولی یا مجبوری پر مبنی پیشہ

سمجھا جانے لگا۔ مشرقِ بعید کے مختلف حصوں سے خواتین مختلف معاشی و سماجی مجبوریوں کے تحت ان شہروں کی طرف منتقل ہوئیں، جہاں وہ اس پیشے سے وابستہ ہو گئیں اور اکثر اوقات اس دائرے سے نکلنا ان کے لیے مشکل ہو گیا۔

شگفتہ فرامزید اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ جدید دور میں مختلف ممالک نے اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے مختلف پالیسیوں اور اصلاحی اقدامات کی کوششیں کیں۔ بعض ریاستوں میں متبادل روزگار اور سماجی بحالی کے پروگرام متعارف کرائے گئے، تاہم بعض سیاسی و معاشی نظاموں کے تحت یہ مسائل مکمل طور پر حل نہ ہو سکے۔ اس کے برعکس بعض ممالک میں اس نوعیت کے پیشوں کے خلاف سخت قانونی اقدامات بھی موجود ہیں:

دورِ جدید میں سوویت یونین اور چین نے اس کاروبار میں ملوث عورتوں کو متبادل ملازمتیں اور سماج میں مقام دلانے کی کوشش کی مگر سوویت یونین میں کمیونزم کے اندازِ حکمرانی نے عورتوں کو دوبارہ اس کاروبار میں دھکیل دیا ہے جب کہ چین میں سرکاری طور پر اس دھندے کے خلاف سخت قوانین موجود ہیں۔^{۱۲}

تائینٹیت اور ”بے راہِ رو عورت“ کے تصور کو پاکستانی خواتین کے سفر ناموں میں ایک اہم اور متنازع موضوع کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ شین فرخ کے سفر نامے نئی دنیا پرانی دنیا میں لندن کے سوہو علاقے کو عورت کی تجارتی نمائش کی علامت قرار دیا گیا ہے، جہاں عورت محض ایک جنس کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اسی طرح رضیہ بٹ کے امریکی یا ترائیا میں جسم فروشی، غربت اور اخلاقی زوال کی منظر کشی عورت کے استحصال کی ایک تلخ تصویر پیش کرتی ہے۔ بشری رحمن نے اپنے سفر نامے براہِ راست میں کینیڈا کے معاشرتی رویوں کا تجزیہ کرتے ہوئے مغربی عورت کی آزادی، بوائے فرینڈز کے ساتھ تعلقات، اور مسلمان لڑکیوں کی غیر مسلموں سے شادیوں کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے نزدیک یہ طرزِ زندگی خاندانی نظام کے وقار کو مجروح کرتا ہے اور عورت کو جذباتی و اخلاقی عدم تحفظ سے دوچار کر دیتا ہے۔ یوں ان سفر نامہ نگاروں کے مشاہدات اس تاثر کو تقویت دیتے ہیں کہ مغرب میں دی جانے والی آزادی کو تائینٹیت کے نام پر پیش کیا جاتا ہے، مگر بعض صورتوں میں اسے ”بے راہِ رو“ کے طور پر دیکھا گیا ہے۔

اسی تسلسل میں پروین عاطف کے ڈیوآسنی میں یورپ میں آزادی نسوان کے منفی پہلوؤں کو

اجاگر کیا گیا ہے، جہاں لندن کی کردار ”کیتھرائن“ شادی سے انکار اور مردوں سے بے زاری کی نمائندہ ہے۔ ثریا آصف کے سفر وسیلہ، ظفر میں سیلجیم کے کیسینو کا منظر پیش کیا گیا ہے، جہاں نیم عریاں لباس میں عورتیں مردوں کو جو اکیلے میں معاونت فراہم کرتی ہیں، جو ان کے نزدیک عورت کے استحصال کی ایک نئی صورت ہے۔ کوکب خواجہ کے ہیلو امریکہ میں سان فرانسسکو کی ہم جنس پرستی کی پریڈ کو مشرقی و اسلامی اقدار کے تناظر میں بے راہ روی قرار دیا گیا ہے، جب کہ عمرانہ کو مل نے سفر نامہ ملتانی بنجان اور کولمبس کے دیس میں کے اندر نیویارک میں ہم جنس پرست خواتین کے ازدواجی تعلقات کو ایک عام سماجی حقیقت کے طور پر پیش کیا ہے، جو ان کے لیے اجنبی مگر مغربی معاشرے میں معمول کی بات ہے۔

مزید برآں، کسٹور ناہید نے اپنے سفر نامے میں ہم جنس پرست عورت کو مردانہ جبر کے مقابل نرمی اور باہمی رضامندی کی علامت کے طور پر پیش کیا، جب کہ سبوحہ خان نے عورت کو گھر بیو ذمہ داریوں سے فرار اور خود غرضی کے تناظر میں دیکھا اور تحریر کیا۔ اسی طرح ثریا حفیظ الرحمن نے مذہب اور روایت کے نام پر عورت کے استحصال اور آزادی دونوں پہلوؤں کو نمایاں کیا، جب کہ شگفتہ فراز نے سماجی و معاشی دباؤ کے تحت عورت کے کردار کو واضح کیا۔ ان مختلف بیانیوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ”بے راہ روی عورت“ کوئی یکساں یا جامد تصور نہیں بلکہ مختلف سماجی، ثقافتی اور معاشی عوامل کے تحت بدلتا رہتا ہے۔

ان تمام مثالوں کے تناظر میں یہ واضح ہوتا ہے کہ مغربی اور جنوبی ایشیائی معاشروں کے درمیان بنیادی فرق انفرادی اور اجتماعی اقدار کا ہے۔ مغرب میں انفرادی آزادی کو ترجیح دی جاتی ہے، جب کہ جنوبی ایشیا میں اجتماعی اقدار صنفی رویوں کو متعین کرتی ہیں۔ یہی فرق اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ صنفی حدود فطری نہیں بلکہ ثقافتی طور پر تشکیل پاتی ہیں۔ اسی بنیاد پر ان سفر ناموں میں ”صنفی بے راہ روی“ کو محض اخلاقی انحراف کے طور پر نہیں بلکہ ایک بیانیاتی اور علامتی عمل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ بعض مواقع پر خواتین کردار روایتی توقعات سے ہٹ کر اپنے فیصلے خود کرتی ہیں، جو ان کی خود مختاری کی علامت بن جاتے ہیں۔ جوڈتھ بٹلر کے تصورِ performativity کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ طرز عمل دراصل صنفی شناخت کی از سر نو تشکیل ہے، نہ کہ محض سماجی اصولوں کی خلاف ورزی۔ اسی طرح سیمون دی بووا کے نظریے کے مطابق عورت ان متون میں اپنی ”تشکیل شدہ شناخت“ کو چیلنج کرتی ہے اور اسے نئے معنوں میں ڈھالتی ہے۔ ان سفر ناموں میں اخلاقی حدود اور بے راہ روی کے درمیان ایک مسلسل مکالمہ موجود ہے۔ جو رویہ ایک

معاشرے میں ”بے راہ روی“ سمجھا جاتا ہے، وہی دوسرے معاشرے میں معمول بن جاتا ہے۔ اس تضاد سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اخلاقی تصورات آفاقی نہیں بلکہ سماجی و ثقافتی تشکیل کا نتیجہ ہیں۔ لہذا ”صنفا بے راہ روی“ کو ایک جامد اخلاقی زمرہ سمجھنے کے بجائے ایک ثقافتی تعبیر کے طور پر دیکھنا زیادہ مناسب ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستانی خواتین کے سفر نامے ”بے راہ روی عورت“ کے تصور کو ایک رنجی انداز میں پیش نہیں کرتے، بلکہ اسے ایک پیچیدہ اور کثیر جہتی مظہر کے طور پر دکھاتے ہیں۔ کہیں یہ کردار روایت شکنی، خود غرضی اور خاندانی نظام سے انحراف کی علامت بنتا ہے، تو کہیں یہی عورت اپنی شناخت، آزادی اور حق انتخاب کے لیے جدوجہد کرتی ہوئی ایک مزاحمتی اور خود مختار وجود کے طور پر سامنے آتی ہے۔ چنانچہ ”بے راہ روی عورت“ کو محض اخلاقی زوال کی علامت سمجھنا ناکافی ہے؛ درحقیقت یہ ایک ایسا استعارہ ہے جو پدرسری نظام کے خلاف مزاحمت، خود اختیاری اور نئی معنویت کی تشکیل کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح ”ثقافتی معنویت“ مختلف معاشروں میں معنی کے تغیر اور تشکیل نو کے عمل کی عکاسی کرتی ہے۔ یوں خواتین کے سفر نامے محض جغرافیائی سفر نہیں بلکہ ایک فکری، سماجی اور وجودی سفر کی نمائندگی کرتے ہیں، جہاں عورت اپنی شناخت کو نئے زاویوں سے دریافت کرتی ہے۔

حوالہ جات

1. Simone de Beauvoir, *The Second Sex*, trans. H. M. Parshley (New York: Vintage Books, 1952), 281.
2. Judith Butler, *Gender Trouble: Feminism and the Subversion of Identity* (New York: Routledge, 1990), 33.

۳۔ ایضاً، ۱۷۹۔

۴۔ شین فرخ، نئی دنیا پرانی دنیا (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء)، ۶۱۔

۵۔ بشری رحمن، براہ راست (لاہور: وطن دوست لمیٹڈ، ۱۹۸۳ء)، ۲۰۵۔

۶۔ ایضاً، ۲۷۳۔

۷۔ ایضاً، ۲۷۵۔

۸۔ پروین عاطف، ٹپرواسنی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)، ۱۰۱۔

۹۔ ایضاً، ۱۰۳۔

۱۰۔ ثریا آصف، سفر وسیلہ ظفر (سفرنامہ یورپ) (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۰۷ء)، ۱۰۰۔

- ۱۱۔ رضیہ بٹ، امریکی یانٹرا (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)، ۳۳۲۔
- ۱۲۔ ایضاً، ۳۷۵۔
- ۱۳۔ کوکب خواجہ، ہیلو امریکہ (لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ۸۱۔
- ۱۴۔ عمرانہ کومل، ملتان بنجارن اور کولمبس کا دیس (فیصل آباد: مثال پبلی شرز، ۲۰۲۱ء)، ۱۳۳۔
- ۱۵۔ کشور ناہید، آجاؤ افریقہ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)، ۱۵۹۔
- ۱۶۔ ایضاً، ۱۶۳۔
- ۱۷۔ ایضاً، ۱۶۵۔
- ۱۸۔ ثریا حفیظ الرحمن، جس دیس میں گنگا بہتی ہے (اسلام آباد: بک ٹاؤن، ۱۹۹۵ء)، ۸۳۔
- ۱۹۔ ایضاً، ۸۴۔
- ۲۰۔ سبوحہ خان، دلی سے ڈیفنس (کراچی: سٹڈی سرکل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء)، ۹۸۔
- ۲۱۔ ڈاکٹر شگفتہ فراز، ستارے سفر کے (لاہور: نگارشات پبلشرز، ۲۰۰۸ء)، ۱۸۸_۱۸۹۔